حیاتِ قادر

مؤلف

عبید اللہ دُرّانی

باب نمبر ۱۰

دربارِ خاص

اب جو دو چار دن یہاں رہنا ہے تو آیئے گھوم پھر کر دیکھیں یہاں کون کون رہتا ہے اور کیا کیا ہوتا ہے۔ محفل خانہ سے متصل کبوتروں کا ایک بہت بڑا کمرہ بنا ہوا ہے۔ دودھ جیسے سفید لقا کبوتر کس مزے سے رقص کرتے نظر آتے ہیں۔ ان سے کیسی محبت اور کیسا پیار ٹپکتا ہے۔ کاش ان بھولے معصوم کبوتروں کے برابر ہم میں پیار و محبت ہوتا تو آج ہم اسفل السافلین کی حد تک نہ گر چکے ہوتے۔

ذرا آگے بڑھیے ایک مجذوب خلقت کی طرف پیٹھ کئے ہوئے اونچی آواز میں اس قدر فحش اور تازہ تازہ گالیاں بک رہے ہیں کہ ہنسی بھی آتی ہے اور غصہ بھی۔ معلوم ہوتا ہے یہ بزرگ برسوں اسی دربار کی بکریاں چراتے رہے ہیں۔ بکریوں کا ایک بہت بڑا گلہ ہے جو رات کے وقت ان ہی کی جھونپڑیوں میں بند کر دیا جاتا ہے۔ ہیں تو دیوانہ مگر اللہ جانے کس کے دیوانہ ہیں کہ یہ حالت ہے کہ آپ پشت سے ابھی قریب بھی نہیں پہنچے کہ آپ کا آگا پیچھا سب کچھ کسی بکری یا درخت کو مخاطب کر کے کہہ ڈالا۔ ہنستے بھی جاتے ہیں اور گالی بھی دیتے جاتے ہیں۔ اب قریب پہنچ کر سلام بھیجئے تو جواب ندارد اور دعا کے لئے عرض کیجئے تو دس بیس مغلظ گالیاں دے ڈالتے ہیں۔

اب ذرا آگے بڑھیئے ایک اور مستانہ نظر آتے ہیں۔ ان کا ایسا بھولا چہرہ ہے کہ جیسے ان گایوں کا جن کے گلے کو محبت اور شفقت کے ساتھ جنگل میں چرانے کے لئے یہ لے جایا کرتے ہیں۔

آگے بڑھیئے تو ایک بڑا جھونپڑا ہے جو لنگر خانہ کہلاتا ہے۔ کچھ عورتیں یہاں ترکاری بنا رہی ہیں، کچھ چاول صاف کر رہی ہیں بطخ، قاز، مرغیاں اور کتوں کے آٹھ دس پلّے دروازہ کے آس پاس ناک جھانک میں ڈٹے ہوتے ہیں۔ اس لنگر خانہ میں روزانہ چالیس پچاس خادم اور کئی غرباء کھانا کھاتے ہیں۔ نہ کوئی جائداد ہے اور نہ کوئی ذریعہ آمدنی۔ حالت یہ ہے کہ معلوم نہیں ہوتا کہ کل چولھا سلگے بھی کہ نہیں۔ نہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، نہ کل کے لئے آج ہی سے فکر مند ہونا۔ خادم یہ کہتے ہیں کہ کل کے لئے بھی وہی کرے گا جو آج تک کرتا چلا آیا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ لنگر خانہ کا انتظام کرنے والی عورتوں کو یقین ہے کہ صدہا انسان، چرند و پرند اس دربار میں نہ کبھی بھوکے رہے اور نہ کبھی بھوکے رہ سکتے ہیں۔ اسی لئے کبھی دودھ اور گلاب کی چائے دیگوں میں بن رہی ہے تو کبھی

ہفتوں تک پلائوں اور بریانی پکائی جارہی ہے۔ کبھی کبھی قانونِ قدرت کا اُتار چڑھائو برقرار رکھنے کے لئے بجائے تین وقت ایک یا دو ہی وقت کھانا پکتا ہے اور کبھی سادہ چاول اور چٹنی پر گزارہ ہوتا ہے مگر بھوکا کبھی کوئی نہیں رہا ہے۔

رزق کا ربوبیت سے تعلق ہے اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی معراج میں اللہ جل شانہٗ کو میرا رب ہی کہہ کر پکارا ۔اس میں ایک عجیب راز پنہاں ہے۔ رزق ایک نشان ہے پرورش کا زندگی کا اور حیات کا۔ فطرت کا تقاضا تسلسلِ نسل کیلئے اس بھوک ہی کے ذریعہ پورا ہوتا ہے۔ اسی لئے پیٹ کی بھوک اچھے اچھوں کو بُرا بنا دیتی ہے۔ اگر آپ کبھی ہفتوں بھوکے رہے ہوں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ پیٹ کی آگ کس چیز کو کہتے ہیں اور یہ کہ فقیر کو کیوں غریبوں اور بھوکوں سے اتنا اُنس ہوتا ہے۔ یہ لنگر خانہ دنیا کی نظر میں تو کئی جانوں کی رزاقی کرتا ہے۔ مگر اہلِ نظر کے لئے یہاں ربوبیت کی نشانی ہے۔ جو معنی تخلیق ہے، اور روانی وجود ہے اور ازل سے ابد تک باطن کے سلسلے کی ایک سیڑھی ہے۔ لنگر خانہ سے آگے چلئے تو جھونپڑیاں ہیں جن میں کچھ لوگ بسے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جو اپنا بھید بتاتے ہیں کہ کیسے آئے اور کیوں یہاں بسے۔ ان میں اکثر ایسے ہیں جو یہاں پر ہمیشہ کے لئے بس گئے ہیں۔ ان جھونپڑیوں سے آگے بڑھیئے تو سڑک کے دونوں طرف وہ مسافر ہیں جو عموماً مہلک بیماریوں سے شفا کی خاطر یہاں آکر پڑ گئے ہیں۔ دو سال پہلے ان لوگوں کی یہ حالت تھی کہ ان کے جسم جذام سے گلے ہوئے تھے اور ان کے زخم ایسے رِس رہے تھے کہ ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھنا بھی بہت مشکل کام تھا۔ اب تقریباً سارے زخم سوکھ گئے ہیں۔ دوسروں سے یہ لوگ ہاتھ ملاتے ہیں اور صرف غور کر کے دیکھنے سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ذرا ذرا سی سُرخی اور خفیف سے نشان ابھی اور باقی ہیں۔ ان لوگوں میں آٹھ دس ایسے غریب جذامی بھی ہیں جو شہر کی گلیوں میں بھیک مانگ کر نامعلوم کس لئے اپنی زندگی کو قائم رکھنے کی کوشش میں تھے۔ مگر اب اس قابل ہوگئے ہیں کہ سخت مزدوری کرتے ہیں اور لوگ ان سے بچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ کچھ ایسے غریب بھی ہیں جن کو سال ڈیڑھ سال پہلے دیکھا تھا کہ ان کا نچلا بدن رکھ کر ایک گٹھری کی طرح سمٹ گیا تھا اور یہ لوگ زمین پر گھسٹ گھسٹ کر بھیک مانگا کرتے تھے۔ اب ان میں سے کچھ لوگ لکڑی کے سہارے اور کچھ بغیر سہارے چل پھر رہے ہیں۔ یہ لوگ مدتوں زمین پر گھسٹتے رہے۔ اب بھی ان کے گھٹنوں پر تھوڑے تھوڑے نشان ضرور ہیں مگر چہرے پر تازگی ہے اور ان کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں احساس ہے کہ وہ زندہ ہیں اور دنیا میں کچھ کریں گے۔

ذرا آگے بڑھیئے تو کہیں دور سے آئے ہوئے ایک رئیس صاحب ہیں جن کو چھ مہینے پہلے سارے ڈاکٹروں اور اطبا نے مکمل کوشش کے بعد یہ کہہ دیا تھا کہ ان کے دماغ کا کوئی علاج ہی نہیں۔ آج یہ بھی ہنس بول رہے ہیں اور اجازت کے خواہاں ہیں کہ پھر سے دنیا میں جائیں اور اپنا کاروبار سنبھالیں کہاں تک بیان کیا جائے۔ نہ معلوم ایسے کتنے لوگ ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی دنیا لئے ہوئے ہے اور اس کی کہانی ایک مستقل داستان بن سکتی ہے۔

ایک بیوہ عورت کی داستان سُنئے جو خاموش تھی مگر خوش نظر آتی تھی۔ اس کا اکلوتا لڑکا جس کی عمر دس گیارہ سال کی ہو گی، عرصہ سے بیمار تھا۔ اس نے بشارت دیکھی اور ماں سے ضد کرنے لگا کہ ہمیں قادر نگر لے چلو۔ غریب ماں نے نہ جانے کیسے پانچ سو میل کا سفر طے کیا اور یہاں آئی۔ چار پانچ دن کے بعد یہ لڑکا جاں بحق ہو گیا مگر ماں کی آنکھ میں نہ اب کوئی آنسو ہے نہ اس کی جبیں پر کوئی غم کے آثار ہیں۔ نہ معلوم وہ کس جنت کے پھول کی خوشبو میں مست ہے۔

اللہ پر یقین تو بقدرِ ظرف تقریباً ہر ایک کو ہوتا ہے ملحد کو بھی کوئی نہ کوئی گمان اور کھٹک ضرور ہوتی ہے اور جو دنیا میں سرگرم ہیں ان کو بھی سکتہ اور سکوت کے روپ میں کبھی نہ کبھی یہ خیال ہو ہی ہو جاتا ہے۔ غرض ہر ایک کو یہ خیال اور یہ یقین ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ پتے پتے کو ہوتا ہے۔ مگر حیات بعد الممات پر یقین بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ یہی یقین بڑی کٹھن منزل ہے۔ قرونِ اُولیٰ کے سادہ اور ان پڑھ مسلمانوں کو اس زمانہ کی جلیل القدر اور عظیم الشان سلطنتوں پر جس چیز نے حاوی کر دیا تھا۔ وہ یہی یقین تھا۔ قابلِ تعریف ہے وہ بیوہ عورت جس کا اکلوتا لال اس دنیا سے چلا جاتا ہے اور وہ اس جدائی کی آگ کو برداشت کرتی ہے۔ اس کا لال آنکھوں سے غائب ہے مگر وہ عالی ضرف ماں کی طرح اس مامتا کو بھی راستہ میں نہیں آنے دیتے جو ماں کی فطرت ہے۔ وہ اپنے پیٹ سے نکلے ہوئے اکلوتے کو اپنے ہاتھوں سے نہلا کر اور سنوار کر زیر زمین دفن کر دیتی ہے مگر روحانی خوشی نہیں کھوتی۔ اس عورت کو حیات بعد الممات کا جو یقین ہے اس کا ایک ذرہ بھی دنیا والوں کو مل جائے تو دنیا کی عشرت اور رنگینیوں پر ایک نظر ڈالنا بھی پسند نہ کریں۔ جس قسم کی خوشی اس عورت کو آج میسر ہے، اس سے اندازہ لگتا ہے کہ ضرور جنت کے پھول کی خوشبو سے یہ عورت آج معطر اور معنبر ہے۔

ایک طرف نظر دوڑایئے تو برگد کے نیچے ایک سادھو آسن مارے بیٹھا ہے۔ اس کا چہرہ اس قدر حسین ہے کہ شاید ہی کسی نے دیکھا ہو۔ یہ سدھو مشہور مصور ئے فائیل کی بنائی ہوئی مسیح کی مورت معلوم ہوتا ہے۔ نازک نقشہ، داڑھی اور سر کے بال ریشمی، دود مکتی ہوئی آنکھیں۔ اس کا کتنا دلکش حُسن ہے۔ اس سادھو کا حال یہ ہے کہ یہ ایک جنوبی ہند کا برہمن ہے۔ اس نے چودہ سال کی عمر میں میٹرک پاس کرنے کے بعد ویراگ اختیار کر لیا اور بائیس سال ہندوستان تبت اور ہمالیہ کی بڑی بڑی خانقاہوں میں گیا اور رشیوں کی خدمت کرتا رہا پھر بھی کچھ نہ ملا۔ آخر مایوس ہو کر گھر لوٹ رہا تھا کہ اتفاقاً ادھر بھی آ گیا اور بابا صاحب کے سامنے پہنچ کر بہت سخت و سست سنانے لگا کہ تم لوگ مہاتما بنے بیٹھے رہتے ہو۔ مانا کہ آسمانوں پر پرواز کرتے ہو اور چاند سورج کو مٹھی میں لئے ہوتے ہو مگر ہمیں اس سے کیا۔ تم لوگوں کا سارا طبقہ نہایت ہی خود غرض اور ظالم ہے۔ کوئی کسی کو کچھ نہیں دینا۔ بابا صاحب نے غور سے سُنا اور یہ ارشاد ہوا کہ ایسا مت کہو۔ یوں کہو کہ تم نے بہت چکر کاٹے مگر تمہارے مقدر کا پھل کہیں اور ہی تھیا، ایک آدھ دن اس برگد کے نیچے گزارو پھر چلے جانا۔ یہ سادھو وہاں سے مذبذب لوٹا اور یہ سوچ کر کہ چلو جہاں ایک عمر گزار دی، یہ ایک رات اور

سہی۔ بغیر کسی خیال یا اُمید کے اس برگد کے نیچے لیٹ رہا۔ صبح بابا صاحب دربار میں رونق افروز ہوئے تو دیوانہ وار جا کر بابا صاحب کے قدموں سے لپٹ گیا۔ کوئی بات چیت نہیں ہوئی واللہ اعلم اس ایک رات میں کیا کچھ ہو گیا۔ یہ سترہ دن اسی برگد کے نیچے پڑا رہا۔ اس کے بعد اس کا جو گیانہ لباس اتار کر دریا میں پھکوا دیا گیا اور اس کو ایک سفید جبّہ اور تہبند عطا ہوا، اور حکم ملا کہ تم بھدراچلم کے رامیشور مندر کے قریب جو ایک پرانا درخت ہے اس کے نیچے بیٹھو۔ اس سادھو کی تو ایک مثال ہے۔ ایسے نہ معلوم کون کون یہاں آتے ہیں اور جانے کیا کیا لے جاتے ہیں۔ یہ خاصانِ خاص کا معاملہ ہے۔

اور آگے چلئے ایک برگد کے نیچے ایک چھوڑے بچے کے بال اُتارے جا رہے ہیں۔ اس کے ادھیڑ عمر کے ماں باپ پاس ہی کھڑے ہیں۔ بچہ بہت خوبصورت اور تندرست ہے۔ یہ لاولد تھے۔ اجازت لے کر گئے تھے اور خوش خوش نیاز منانے کے لئے آئے ہوئے تھے۔

ایک اور برگد کے نیچے دو بڑے بڑے دیئے جل رہے ہیں۔ یہ اس لئے ہیں کہ کسی خاندان کی زندگی کا تسلسل جو ختم ہو چکا تھا آج پھر سے جاری اور روشن کر دیا گیا۔ یہ امر جیوتی کا سلسلہ اب جاری رہے گا۔ اسی لئے آج شام کو نیاز ہے۔ دس من کی دیگ پکے گی۔ امیر اور غریب سب زمین پر بیٹھ کر اس میں شرکت کریں گے۔ دیکھا گیا ہے کہ یوں تو بابا صاحب چاہے آپ کچھ بھی کریں آپ کی ہر چیز کو پسند فرماتے ہیں مگر خوش ہوئے ہیں تو غریبوں کو کھانا کھلانے سے۔ ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے انہیں بری بھوک تھی اور جو کھانا یہ بھوکی خلقت کھاتی ہے وہ گویا آپ ہی کھاتے ہیں۔ اس کھانے میں کوئی خیرات اور ثواب کا سوال نہیں۔ کبھی کبھی آپ کو یہ فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ دل سے کوئی کیا دعا کر سکتا ہے۔ اس چودھویں صدی میں تو دل کا پتہ ہی نہیں، مگر پیٹ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ پیٹ کی دعا اور مقبولیت میں کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ جو بھوکے کا پیٹ بھرتا ہے اور اس کی آگ بجھتی ہے تو وہ خود ہی دعا ہے۔ کچھ منہ سے کہنے کی ضرورت نہیں۔ وہی ایجاب ہے اور وہی قبول ہے۔ اس قسم کی دعوتیں اور نیاز آئے دن ہوتی ہیں۔ اس قسم کے موقعوں پر اس چھوٹی سی بستی کے غریبوں کی خوشی کا تو کیا ذکر۔ وہاں جو بہت سے کتے رہتے ہیں ان کی کود پھاند اور چہل پہل تک دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔

یہ تو تھے آس پاس کے حالات۔ رہا محفل خانہ۔ تو وہاں جب کوئی نہ ہو تو دن کو آرام کر سکتے ہیں۔ اگر آپ پر کرم ہے تو دوپہر کے وقت ایک خادم آتا ہے اور کہتا ہے کہ چلئے بابا صاحب نے کھانے پر بلایا ہے۔ بابا صاحب کا کھانا ان کی بہن کے یہاں سے ایک توشہ دان میں آتا ہے۔ لنگر خانہ کا کھانا بھی موجود ہوتا ہے اور جو کھانا باہر کے آئے ہوئے خوش حال مسافروں نے بھیج دیا وہ بھی ہوتا ہے۔ محفل خانہ کی پشت پر جو دو کمرے بنے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک کمرہ میں ایک طرف چارپائی بچھی ہوتی ہے اور اس

کے بازو میں زمین پر دستر خوان بچھا دیا جاتا ہے۔ ایک خادم برتنوں میں کھانا نکال کر سب کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ بابا صاحب دستر خوان کے سرے پر بیٹھتے ہیں اور ایک طرف راجو ماسٹر جو ایک بہت ضعیف راجپوت ہیں اور جنہوں نے بابا صاحب کو لڑکپن میں الف بے تے پڑھائی تھی، وہ ہیں اور دو ایک اور مہمان۔ دستر خوان کے آداب وہی پرانے زمانہ کے آداب ہیں۔ زبردستی آپ کو اس قدر کھلایا جاتا ہے اتنی خاطر تواضع کی جاتی ہے کہ نہ کبھی ماں باپ کے گھر میں ہوئی ہو گی اور نہ نئی نئی سسرال میں۔

زیادہ کھانے کے باعث کبھی جو آپ کی سانس پھولنے لگے تو بابا صاحب ہنس کر یوں فرماتے ہیں کہ اس کو بھی ریاضت سمجھو۔ اس چھوٹے سے جملہ میں کتنے معنی پنہاں ہیں۔ ایک تو یہ کہ پیٹ کے ضرورت سے زیادہ بھر جانے کے بعد جو انسان اور زیادہ کھائے اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ وہ لذیذ چیزوں کی ساری لذت کو بھول جاتا ہے اور جوں توں جس طرح ہو سکے چبا کر لقمہ کو حلق کے نیچے دھکیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب جو وہ کھاتا ہے تو نفس کی خواہش کے تحت نہیں کھاتا بلکہ حکم پورا کرنے کے لئے کھاتا ہے۔ چاہے آپ دائمی مریض ہی کیوں نہ ہوں، آپ کی پھولی ہوئی سانس دیکھ کر بابا صاحب یوں فرماتے ہیں کہ ہاضمہ کی فکر نہ کرو یہاں سب کچھ بھسم ہو جاتا ہے۔ اور واقعتا یہی دیکھا گیا ہے کہ وہ لوگ جو دس بارہ سال سے آش جَو پر اپنی زندگی کاٹ رہے تھے اس دستر خوان پر خوب پلاؤ اور مچھلی اڑاتے ہیں۔ مگر انہیں کھٹی ڈکار بھی نہیں آتی، اور خانقاہوں میں تو یہ دیکھا گیا ہے کہ روزہ اور فاقہ کے ذریعہ نفس کو جلایا جاتا ہے۔ یہاں نفس کو موٹا کر کے مٹھی میں سمایا جاتا ہے۔ خوب کھاؤ پیو۔ دن بھر گانے سنو۔ سیر کرو اور ہنستے بولتے، کودتے پھاندتے منزلیں طے کرتے جاؤ۔ یوں فاقہ سے رہ کر شب بیداری آسان ہے مگر بھرے ہوئے پیٹ پر شب بیداری کرنے کے لئے انسان کو نفس سے بالاتر ہو جانا پڑتا ہے۔ اور یوں اس کو تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔

یہ کھانے کا وقت بھی خاص وقت ہوتا ہے۔ اس کو دربار خاص کہیں تو بیجا نہ ہو گا۔ اس لئے کہ تمام عمیق اشارات، دور رس ہدایات اور خدا جانے کیا کیا رمز اس دستر خوان پر فرمائے جاتے ہیں۔

ایک چینی فلسفی لن یت سین جو ایک بہت بڑا فلسفی گزرا ہے۔ مہذب لوگوں کے ذوقِ طعام کے متعلق لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ تاریخ انسانی میں جنگلی لوگوں سے لے کر مہذب ترین سلطنتوں تک کے سارے سمجھوتے اور فیصلے اور ساری گتھیوں کا سلجھانا اور آپس میں صلح کے فیصلوں پر پہنچنا یا لین دین اور بین الاقوامی تعلقات پر ایک رائے ہونا۔ دستور ساز اسمبلیوں میں نہیں ہوا بلکہ یہ سب دستر خعان کے تصرف سے ہی وجود میں آیا ہے۔ انسان خصوصاً مرد چاہے وہ کتنا بڑا عالم ہی کیوں نہ ہو کسی حد تک پیٹ کا کچا ہوتا ہے۔ پیٹ کی لگی ہوتی ہے تو اللہ سے بھی لگائو رکھتا ہے۔ مگر جب پیٹ کو شانتی اور سکون میسر نہیں آتا تو یا تو اپنی سطح سے گر کر نفس ہی

نفس ہو کر رہ جاتا ہے یا اگر اس میں کچھ ہے تو نفس سے اُٹھ کر مولیٰ کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے۔ یہی اس کے لئے ایک نازک پل صراط ہے۔

ویسے تو بابا صاحب کے سامنے آپ لذیذ کھانے کھا رہے ہوتے ہیں۔ مگر آپ کا سفر پل صراط پر سے ہوتا ہے۔ اچھے اچھے لقمے، چُنے چُنے پھل منت و زاری سے گھگھیا کر آپ کو کھلاتے ہیں۔ اس کے بعد اور تھوڑا سا اور تھوڑا سا کہنا بظاہر خلوص و محبت و اخلاق حسنہ ہے۔ مگر جو آپ بھگتی کے لئے آئے ہیں تو ان سے گزر کر اور آگے چلنا ہو گا۔

عموماً ہر وقت اور خصوصاً اس وقت یہ دیکھا گیا ہے کہ بابا ساحب کا ایک ایک لفظ اور ہر ایک اشارا دفتر معرفت ہوتا ہے۔ بظاہر سادہ گفتگو ہوتی ہے کہ یہ چاول پرانے ہیں، اس اچار میں نمک بہت ہے، ہمیں چھوٹی چھوٹی مچھلیاں بہت پسند ہیں، اس چھاچ میں نمک ہے ہی نہیں۔ مگر جیسا کہ آگے وضاحت ہو گی ایک ہی فقرہ کو لے لیا جائے تو ایک انسانی زندگی کے لئے کافی ہے۔

گرمیوں کے موسم میں صبح ناشتہ کے وقت کمرہ کے باہر درخت پر سے کوئل کی دلفگار آواز کچھ اتنا گہرا اثر کرتی ہے کہ یکلخت بابا ساحب کی زبانِ مبارک سے اور دوسروں کے منہ سے بھی ایک ساتھ یہ آواز نکلتی ہے۔ کیسی پیاری بولی ہے۔ ذرا سی خاموشی کے بعد بابا صاحب یوں متکلم ہوتے ہیں۔ ”تمہیں معلوم ہے کہ کوئل کیا بول رہی ہے۔ یہ اپنے بچوں کو اپنی طرف بُلا رہی ہے۔ یہ بڑا بھولا پرندہ ہوتا ہے۔ اسے اپنے انڈوں کو خود سینا نہیں آتا۔ کوے کے گھونسلہ میں اپنے انڈے رکھ آتی ہے۔ کوا ہوتا تو بڑا سیانا ہے مگر اپنے ہی انڈے سمجھ کر کوئل کے انڈے سیتا ہے۔ جب بچوں کے بال و پَر نکل آتے ہیں تو کوئل کو اپنے بچوں کی یاد ستاتی ہے اور وہ اس درد بھری آواز میں پکارتی ہے۔ بچے پھڑ پھڑا کر اُڑتے ہیں اور اپنی ماں سے آملتے ہیں۔“

بظاہر یہ ایک معمولی بات ہے جو اکثر سُنتے آئے ہیں۔ واقعہ یہ تھا کہ اس وقت دستر خوان پر آپ کے ایک مرید بھی تھے۔ جو کچھ پڑھ لکھے بھی تھے اور عالم بزرگوں کے زیادہ قائل تھے۔ یہ صاحب کہیں شمالی ہند میں ایک عالم قلندر سے دو تین سال تک صرف لا الٰہ کی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بڑی گرمی تھی، خوب سینک ملی۔ انڈے سے بچہ نمود میں آیا اور بال و پر بھی پھوٹے مگر اب کسی تربیت کی ضرورت تھی۔ کوئل نے آواز دی اور بچہ یعنی مرید اپنے پیر کے قدموں میں پھر سے آگیا۔

کتنے لطیف اور عمیق انداز سے اس دستر خوان پر گفتگو ہوتی ہے۔ اس کی کیا توضیح کی جائے۔ یہ دربار خاص جو ٹھہرا، اور ہر ایک سے خصوصیت جو ہوئی۔ خدا جانے ایسے کتنے خاص الخاص اشخاص اس دستر خوان سے سیر ہو کر نکلے ہیں۔ چونکہ حضور کی تعلیمات کا نچوڑ (خصوصاً طالبانِ حق کے لئے) اسی دربار سے ملتا ہے۔ اس لئے چند اور مجلسوں کا ذکر درج ذیل ہے۔

آپ کھانے کی چیزوں میں مچھلی کو بہت پسند فرماتے ہیں۔ بظاہر مچھلی نرم، گرم اور لذیذ ہوتی ہے۔ مگر ایک خادم کا بیان ہے کہ برسوں مچھلی کی تعریف اور وضاحت اور اس شوق کی بابت سُننے کے بعد اس کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بابا صاحب کو جنہوں نے اپنے آپ کو جلا جلا کر پھونک ڈالا ہے کھانے پینے کی چیزوں کی لذتوں سے کیا واسطہ۔ ایک وقت ارشاد ہوا تھا کہ چوپائے تو میدانوں میں خوب سیر ہو کرتے ہیں۔ خوب زقندیں بھرتے اور چھلانگیں لگاتے ہیں اور چھوٹی موٹی ندی بھی راستہ میں آجائے تو ہاتھ پیر چلا کر پار نکل جاتے ہیں مگر سمندر کی پیراکی تو مچھلی کے ہی حصہ میں ہے۔ اس کے ہاتھ پیر نہیں ہوتے مگر وہ اپنی ریڑھ کی ہڈی کے بوتہ پر اپنا سفر طے کرتی ہے۔ تو اس کی کچھ سمجھ میں آیا۔ اللہ اللہ کتنا لطیف اشارہ تھا کہ جو یائے حق اپنے کسب سے بھی بہت سے منازل طے کر لیتے ہیں۔ مگر عرفان کا سمندر صم ''بکم'' یعنی عملِ ظاہر سے ماوراہو کر باطن ہی کے ذریعہ (ریڑھ کی ہڈی کے بوتے پر) طے کر سکتے ہیں۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوتا ہے بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کو کھا جاتی ہیں۔ ایک دفعہ ایک بہت چھوٹی سی مچھلی دکھا کر ارشاد فرمایا۔ یہ مچھلیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ انسان کا رجحاں اگر چھٹپن سے ہی حق کی طرف ہو تو اس کا پیر کامل بہت جلد اپنے میں بسا لیتا ہے۔ ایک دفعہ ایک خادم کو ایک مچھلی کا ٹکڑا دے کر ارشاد ہوا دیکھو اس میں کتنے بڑے اور سخت کانٹے ہیں۔ انہیں نکال کر کھاؤ کہیں حلق میں پھنس نہ جائیں اور عموماً آپ جب کبھی بھی کسی کو مچھلی کا ٹکڑا اپنے دست مبارک سے مرحمت فرماتے ہیں تو اچھی طرح دیکھ دیکھ کر ایک ایک باریک سے باریک کانٹا نکال کر پھر چُپکے سے ہاتھ میں رکھ دیتے ہیں۔

ایک خادم کا بیان ہے کہ برسوں تک اس کو یہ کہہ کر مچھلی کا ٹکڑا عنایت ہوتا تھا کہ دیکھو اس میں بہت باریک ایک دو کانٹے ہیں۔ نظر بھی نہیں آتے۔ ایک مدت بعد بڑی مشکل سے اُس خادم کی سمجھ میں آیا کہ مچھلی طلبِ حق کو کہتے ہیں اور کانٹے شک و گمان کو کہتے ہیں۔ ایک دفعہ ارشاد ہوا کہ ویزاک کے ساحل پر آدم خور مچھلی جو بھینسے کے برابر ہوتی ہے آئی ہوئی ہے۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے۔ ایک لڑکا جو تیرنے کی غرض سے گیا تھا ہڑپ کر لیا بیچارہ گیا تھا نہانے اور مر گیا۔ ماں باپ روتے ہوں گے۔ ایک اور دفعہ ارشاد ہوا کہ سمندر جہازوں پر ہی پار کیا جاتا ہے۔ چودھویں صدی کے جہاز بھی پورے شہر کے شہر ہوتے ہیں۔ ان میں سینما بھی ہوتے ہیں۔ کھیل کود کے سامان بھی، ناچ گانے بھی ہوتے ہیں۔ ہر کھانا ایک بڑی زور دار دعوت ہوتا ہے مسافروں کو یہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ ہم کس تیز سے سفر طے کر رہے ہیں۔ چاہے وہ مسافر باورچی ہو یا بھنگی، تاجر ہو یا حاکم، سب کا سفر بڑے مزے سے کٹتا ہے، عیش و آرام میں کٹتا ہے صرف کپتان ہے کہ چوبیس گھنٹے چوکنا رہتا ہے اور اتنی مخلوق جو جہاز میں ہوتی ہے ان سب کی ذمہ داری اور صحیح و سلامت ساحل تک پہنچانے کا انتظام اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ راستہ کے طوفان کی خبر زمین دوز چٹانوں کی احتیاط۔ غرض کہ منزل کی ساری راہ و رسم سے خوب واقف ہوتا ہے۔

ان سب باتوں کی کیا وضاحت کی جائے۔ ایک ایک لفظ ایک استعارہ ہے۔ سمجھنے والے کے لئے اس میں بہت کچھ ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ چودھویں صدی کا جہاز موجودہ زمانہ ہے اور کپتان پیر کی ذات ہے۔

کبھی ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نگل گئی تھی۔ پیٹ میں بڑی تاریکی بڑی گرمی اور بڑی گھبراہٹ ہوگی مگر جب ان کو ساحل پر لے جا کر اُگل دیا تو ان کے جسم پر کوئی زخم نہ تھا۔ اس ارشاد میں معرفت کا سمندر پار کرنے کا ایک یہ بھی طریقہ بتایا گیا ہے۔ اکثر ارشاد ہوتا ہے ''تمہیں حق کی تلاش کیا ہوگی جو حق کو تمہاری تلاش ہے۔'' بڑی مچھلی کا بہت ہی بڑا پیٹ ہوتا ہے اور چھوٹی مچھلیوں کی خود تلاش میں ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ بھوکی ہوتی ہے اور جہاں نظر آئیں ہڑپ کر جاتی ہے۔ لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں حق کی جستجو ہے مگر پیر کامل نہیں ملتا۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر آپ میں کچھ صلاحیت ہو تو آپ بچ نہیں سکتے، بھاگ کر چھپ نہیں سکتے۔ بڑی مچھلی ایک نہ ایک دن آپ کو ضرور کھا جائے گی۔ جہاز کا سفر خاص الخاص کے لئے ہوتا ہے۔ یہ عبودیت کا راستی ہے۔ بندہ جب تک ساحل پر رہتا ہے دو پایا مٹی کا پتلہ ہی رہتا ہے۔ مگر کسی زبردست کے دامنِ کرم کے سہارے بڑے بڑے سمندر، سفر کی کاوش و تردد کے بغیر پار کر جاتا ہے۔ پیر کامل کی شفقت و محبت اور کرم کا کوئی کیا اندازہ لگا سکتا ہے۔ یوں سمجھیں جیسے ایک ذات میں ستر ماں باپ ایسا دل پیر کامل ہی رکھ سکتا ہے۔

ایک دفعہ ۱۹۴۷ء میں ایک نووارد مہمان دستر خوان پر بیٹھے تھے۔ اس زمانہ میں مسلمانوں پر جو گزر رہی تھی۔ اس سے ان کو بڑا جوش تھا۔ معصوم بچے، پاک طینت عورتیں اور بوڑھے بے قصور سب گاجر مولی کی طرح کاٹے جا رہے تھے۔ یہ نووارد اسی غم و غصہ میں بھرے ہوئے تھے۔ دستر خوان پر برس پڑے کہ آپ فقیر کہلاتے ہیں، کر کیا رہے ہیں۔ ان بے گناہ مسلمانوں پر ظلم و ستم کی قیامت ٹوٹ رہی ہے اور آپ ہیں کہ اپنی مستی میں مست گانے سُن رہے ہیں اور تفریح کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کیا آپ کا دل نہیں اور دل میں قوم کا کچھ بھی درد نہیں۔ بابا صاحب کا ارشاد ہوتا ہے کہ مسلمان تو وہی مسلمان تھے جو ایک مٹھی بھر ہزاروں پر بھاری ہوتے تھے۔ آج کیا بات ہے کہ ساڑھے چار کروڑ کے مارے بھاگ رہے ہیں اور اپنی اپنی جان بچانے سے بھی مجبور ہیں۔ یہ نووارد جواب دیتے ہیں کہ ایمان نہیں وہ ایمان جو حضرت علیؓ کی ذوالفقار تھی۔ وہ علیؓ جنہوں نے در خیبر کو اکھاڑا تھا۔ ایمان کیا چیز ہے۔ وہ کہاں سے ملے گا۔ وہ کیوں ناپید ہے۔ اس کے جواب میں بابا صاحب فرماتے ہیں۔ انسان کیمیاوی نسخہ بھول گیا دیکھو میں تمہیں کیمیا کا نسخہ بتاتا ہوں۔ بڑا ہی سادہ نسخہ ہے یعنی صرف تیل، ہلدی اور مرچ۔ بس کل اتنا ہی کافی ہے۔ اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے۔

اس نووارد کو ایک دھکا سا لگا کہ میں بے گناہوں کے قتلِ عام کا رونا رو رہا ہوں اور یہ کیسے بزرگ ہیں۔ کیسی بے ربط اور بے معنی گفتگو کرتے ہیں۔ تیل، ہلدی اور مرچ کی بھی ایک ہی رہی۔ پھر مایوس ہو کر یہ نووارد خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا کر محفلِ خانے

میں سو رہے تو۔ رات کے تین بجے بشارت کی کھڑکی کھلتی ہے اور ان پر جو گزرتی ہے اس کا بیان آگے آئے گا۔ اس بیان میں جو یائے حق کے لئے سب اشارات ہیں۔ اور اس کو اس تلاش کے لئے بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اعلیٰ سادات، زاہد و عابد و عامل رہتے ہیں۔ ساری عمر اللہ کی عبادت میں گزارتے ہیں۔ ہر قسم کی بدی سے پرہیز کرتے ہیں۔ انہیں محبت کی اجرت تو خدا ضرور دیتا ہو گا۔ مگر دولت سرمدی سے اکثر دور ہی رہ جاتے ہیں۔ اور یہ بھی بسا اوقات دیکھا گیا ہے کہ ڈاکو، شرابی کبابی اور فاحشہ عورتیں جنہوں نے اپنی ساری عمر ظلمت اور گناہ میں صرف کی ''ھُو'' کی ایک تان میں کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ولی کامل ہو جاتے ہیں۔ آخر وہ کون سی چیز ہے اور کیا بات ہے جس کو دیکھ کر دیکھنے والا سب کچھ دیتا ہے۔ اس بات کا راز۔ اس راستہ کا پتہ جو اس بات تک پہنچائے ان ہی بظاہر تین بے معنی الفاظ یعنی تیل، ہلدی اور مرچ سے نکلتا ہے۔ اس ک وضاحت آگے ہو گی۔ مگر زبان کی تنگ دامنی کی وجہ سے اس کی تشریح بھی اشارہ اور کنایہ میں ہو گی۔

کیمیائے سعادت:

میں نے پروہت سے پوچھا کہ بشارت کی کھڑکی کیونکر کھلتی ہے۔ پروہت نے کہا۔ سادھو جی کسی زمانہ میں تمہیں کیمیا بنانے کا بڑا شوق تھا۔ تانبے کو پاک کر کے جسامت کو ٹھول اور ملائم بنا کے اس کو رنگ کر سونا بنانے کا شوق دتھا۔ مگر آج اس کیمیا کی بابت بھی سُن لو جو ایک مٹی کے ڈھیر کو خالص سونا اور کندن بنا دیتا ہے۔

نگاہِ آن حکیمے نے نوازے

غبارِ رہ گزر را کیمیا کدرد

قدرت کے اور رازوں کی طرح یہ راز بھی اس قدر سادہ اور آسان ہے کہ میں تمہیں بتائوں تو تم کو یقین نہ آئے گا۔ مگر تم مجھ پر یقین رکھو اور آزما کر دیکھا۔ صرف تین چیزوں کی ضرورت ہے۔ تیل، ہلدی اور مرچ۔ یہ حاصل کر لو تو صرف پھونکنے کی ضرورت ہو گی اور کیمیا بن جائے گی۔ تیل مقامِ تسوف میں انسان کی صلاحیت عشق کو کہتے ہیں۔ یا اطبّا کی اصطلاح میں حرارتِ عزیزی کو۔

ہلدی انسان کی وہ صفت ہے جس کے بوتے پر اپنے کو کلیتاً دوسرے کے سپرد کر سکتا ہے۔ یہ عورت کی خصوصی صفت ہے۔ مرچ سے مراد عشق کے چار مقامات ہیں۔ عشقِ مجازی ملت کا درد۔ شہادت اور غازی ہونا۔ اور پھونکنا مُرشد کا حکم۔ یعنی کُنْ فَیَکُوْنَ۔

کُنْ فَیَکُوْن

دلم مست شُد در ہوائے محمدؐ

چو آید نسیمے ز کوئے محمدؐ

سلامے کنم یا کہ بوسم قدم را

بہ ہر طرز باشم فدائے محمدؐ

نوید آمدہ در دیارِ غریباں

کہ تا خلق گیر در دائے محمدؐ

علم گشت شمشیرِ غوثِ ولایت

ید اللہ در آبروئے محمدؐ

ولی کُن فیکوں بہ کارِ جہاں است

کہ وارد ہنوز آرزوئے محمدؐ

(ولی الدین)

دردِ غم فراق کا درماں تم ہی تو ہو

اُجڑے چمن میں یادِ بہاراں تم ہی تو ہو

باطل کے معرکوں میں کیا عشق سربلدن

مولا علی کا خنجرِ برّاں تم ہی تو ہو

رازِ الست کے ہوا میں تاجدارِ حق

مومن کے ذکر و فکر کا قراں تم ہی تو ہو

جنگاہِ خیر و شر میں ہو شمشیر بے نیام

دستِ خدا او قوتِ ایماں تم ہی تو ہو

ناموسِ آڈمیت و شان ربوبیت

تفسیر درس لیس للانساں تم ہی تو ہو

نازل ہوا عبید کے سینے پہ یہ کلام

آیتِ تاج الدین کا عنواں تم ہی تو ہو

خیبر کی وادیوں میں درانی کو بھیج کر

ہنگامہ ہائے عشق پر نزاں تم ہی تو ہو

راہِ طلب میں کھو گئی تھی زندگی مری

راہِ طلب کی منزلِ تاباں تم ہی تو ہو

دل فرطِ شوق سے سوئے قادر نگر رواں

اس بھولے بھٹکے راہی کا ساماں تم ہی تو ہو

بہتا تھا قطرہ قطرہ ان آنکھوں سے شوقِ دید

اب یم بہ قطرہ بر سرِ مژگاں تم ہی تو ہو (رحمن بابا)